Taṣdīq
Vol 6 No 2, 2024

تصدیق

Article

Iqbal Sajid's Poetry: An Analysis

اقبال ساجد کی شاعری: ایک جائزہ

***[1]Dr. Majid Mushtaq, [2]Muhammad Rafique,[3]Ali Raza**
[1]Assistant Professor, Department of Urdu, Government College University, Faisalabad, [2]MPhil Urdu, PST, Government Elementary School, Meerak, [3]M. Phil Urdu, Government College University, Faisalabad
*Correspondence: majidmushtaqrai@gmail.com

[1]ڈاکٹر ماجد مشتاق، [2]محمد رفیق، [3]علی رضا

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، [2]ایم فل اردو، پی ایس ٹی، گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول، میرک، [3]ایم فل اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

DOI:https://doi.org/10.56276/gepamc76

Received:16-08-2024
Accepted:22-10-2024
Online:31-12-2024

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2024 by the authors.

ABSTRACT
Iqbal Sajid is one of the great poets of modern poetry. Having a deep sense of humanity and the prosperity of mankind, no doubt he was a person who was never to be recognized as a good person, but no one can deny his poetic contribution in literature. He died at the age of 49. His poetic contribution, known as poetry, is a soft-hearted person's poetry. Critics only put emphasis on one side. This article will show the other aspects of it. Iqbal Sajid's poetry is a sample of modern thoughts and expressions. Having a sense of humanity, he can be forgotten in the history of Urdu Ghazal.

KEYWORDS: Iqbal Sajid, Earthquakes, Creation of Pakistan, Jawaz Jafri, Political Situation, Stylistics, Signs

شعر و ادب کی تاریخ ایسے ناموں سے بھری پڑی ہے جنھیں اُن کے عہد میں اور مابعد وہ اہمیت نہ دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ناقدین کی یہ روش دنیائے ادب کے لیے حوصلہ افزا نہیں کہ کسی ایک عہد کے کسی ایک نمایاں نام کو سامنے رکھ کر

باقی شعرا کو نظر انداز کیا جائے۔ قیامِ پاکستان کے فوری بعد اس رویے میں مزید شدت نظر آتی ہے۔ باقی صدیقی، احمد مشتاق اور نہ جانے ایسے کتنے ہی نام ہیں جن کا تذکرہ تو کیا گیا مگر ان کے فنی و فکری پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش ناپید ہے۔ انھی شعرا میں ایک نام اقبال ساجد کا بھی ہے۔ اقبال ساجد جدید غزل کے نمایاں ناموں میں سے ایک ہیں مگر ان کی شاعری مختلف قصوں اور حوالوں میں دب کر رہ گئی۔ کسی نے اُسے شخصی حوالوں کی مماثلت کی بنا پر ساغر صدیقی سے متعلق کر کے دیکھا تو کسی نے اُس کی شاعری کے مختلف ناموں سے شائع ہونے کے بکھراؤ سے لُطف لیا۔ اس صورتِ حال میں ان کی شاعری بُری طرح سے نظر انداز ہوئی۔ اقبال ساجد ۱۹۳۹ء میں لندھورا ضلع سہارنپور یوپی (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ (۱)

قیامِ پاکستان کے وقت اقبال ساجد کی عمر آٹھ سال تھی اور دورِ ہنگام میں سنٹرل انڈیا بالخصوص یو۔پی کے مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔ یتیمی کے دکھ اور معاشی مشکلات سے گھرے اقبال ساجد کی حساس طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی۔ اقبال ساجد کا زیادہ وقت کراچی اور لاہور میں گزرا۔ روزگار کا باقاعدہ کوئی سلسلہ نہ تھا۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے ان کے معاشی سلسلہ کے حوالے سے اُن کی بیگم کا انٹرویو کیا اور لکھا:

> ''شادی کے وقت وہ صرف شعر کہا کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اس کے علاوہ میں نے انھیں زندگی میں کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا۔ شادی کے بعد اکثر انھیں کام کرنے کے لیے کہتی تو وہ جواباً کہا کرتے، میں شاعری کے ذریعے ایک دن اتنا امیر ہو جاؤں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ تم دیکھنا میری کتابیں لاکھوں میں فروخت ہوں گی۔'' (۲)

اقبال ساجد کا روزگار ہی شعر کہنا تھا یا یوں کہیے کہ شاعری سے لگاؤ ہی ان کی کل مصروفیت تھی انھیں نہ تو کوئی اور کام آیا اور نہ ہی پسند آیا۔ بقول غلام محمد قاصر:

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا (۳)

اس شعر کے مصداق اقبال ساجد کی محبت، عقیدت سب کچھ شاعری سے تھا۔ زمانہ کی دستبرد اور حالات کی تنگی نے اقبال ساجد کو شاعری سے امیر تو نہ کیا البتہ وہ اپنی غزلیں بیچنے پر مجبور ہوئے۔ اس میں کچھ دخل ان حالات کی سختی کا تھا تو کچھ ان کی طبیعت کا جس نے اپنی شاعری کو ہی اپنی معاشی ترقی کا باعث سمجھ رکھا تھا۔ ان کی کاہلی اور سستی کے ساتھ امیر ہونے کے خواب ان کی شخصیت کی شکست وریخت کا باعث بنے۔ البتہ ڈاکٹر جواز جعفری نے عباس تابش کا قول نقل کیا ہے جو الگ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے اپنے مضمون ''عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟'' میں یہ قول بیان کیا ہے۔ عباس

تابش کہتے ہیں:

"اقبال ساجد کو شراب نوشی کی ذلتوں میں گرانے والا شخص خود ایک معروف شاعر ہے اور لاہور ہی میں مقیم ہے۔ وہ ساجد کی غزل کی لے سے ابتدا سے ہی خوفزدہ ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے ساجد کو شراب کی عادت ڈال دی اور کہا کہ 'تم جتنی شراب پیو گے اتنے ہی بڑے شاعر بنو گے' وہ شاعر جانتا تھا کہ ساجد غریب آدمی ہے کب تک شراب خرید کر پی سکے گا آخر اپنی ہی آگ میں جل جل کر مر جائے گا۔"(۴)

مزید یہ کہ ان کی بیوی کا بھی خیال اسی سے ملتا جلتا ہے۔ اقبال ساجد کی بیگم کا کہنا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ ساجد کو شراب ان شاعروں نے لگائی جو انھیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔"(۵)

ایسے بیانات کا بغور جائزہ لیا جائے تو اقبال ساجد کی بیگم صاحبہ کی حد تک تو بات درست معلوم ہوتی ہے۔ عمومی انسانی رویہ ہے کہ اہلِ خانہ اور رشتہ دار اپنے پیاروں کی عاداتِ بد کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور اس کا الزام ہمیشہ دوسروں پر دھرتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ اقبال ساجد کی بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ ان کا ادبی محافل سے تعلق نہ ہونے کے برابر رہا۔ سوائے ہندوستان کے دورے کے جہاں وہ اپنے خاوند کے ساتھ تھیں اور انھیں بھی اپنے شوہر کی طرح محسوس ہوا اب حالات بدل گئے ہیں اور دن پھرنے والے ہیں اور بقول اقبال ساجد کے ان کی شاعری اب انھیں امیر کر دے گی۔ گھریلو خاتون کا اس طرح کے خواب سجانا فطری عمل ہے۔ وہ کیا سمجھتیں کہ اقبال ساجد کی غزل کی جدت کو سرحد پار سیاسی تناظر میں منفی انداز میں پیش کیا اور سراہا، جس سے مخصوص سیاسی مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں اور ان کی وجہ سے بعد ازاں اقبال ساجد کو ارضِ پاک پر کئی صعوبتوں کا سامنا بھی رہا۔ لہٰذا اس قول کو تو اہمیت دینا بعید از حقیقت ہے بیگم اقبال ساجد کی یہ رائے دوستوں کی پیش کردہ رائے کے نتیجہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

عباس تابش معروف شاعر ہیں، ان کا قول بہر حال اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قول سے کئی ایک سوالات جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ کیا شاعروں میں شراب نوشی کی لت اچنبھے کی بات ہے؟ کیا نوجوان شعرا کو سینئر شعرا اس لت میں مبتلا کرتے ہیں؟ اور سب سے اہم یہ کہ کسی شاعر کا کہنا کہ تم جتنی شراب پیو گے اتنے ہی بڑے شاعر بنو گے؟ ان سوالات کے جواب کے بغیر اس قول کو حتمی سمجھ لینا مناسب نہیں۔ اقبال ساجد جس عہد کا شاعر ہے اس دور کے شعرا میں اس طرح کی عادات عام پائی جاتی تھیں۔ بالخصوص ایک خاص نظریے کے حامل شعرا و ادبا تو اس عادت کو روایت شکنی

کے نام پر استحسان کے ساتھ پیش کرتے تھے۔عباس تابش یہ واضح کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں کہ اقبال ساجد نے پہلی دفعہ شراب کب پی اور اس شاعر جس کا نام لینے سے وہ خود کترا رہے ہیں نے انھیں کیسے جھانسا دیا۔دوسری بات یہ کہ تخلیق کاروں میں اس طرح کا رویہ کسی حیرت کا باعث نہیں بلکہ عمومی ہے۔اگر ہر شاعر کی اس لت کو دوسرے شعرا کے سر تھوپ کر بری الذمہ قرار دینے کی روش رواج پا گئی تو پھر ادبی منظر نامہ اسی طرح کے قیافوں کی تاریخ مرتب کرنے کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔آخری بات تو انتہائی نامناسب ہے۔اقبال ساجد جیسا شاعر جو کسی اور کو خاطر میں نہ لائے، جو خود پسندی کی اس انتہا کو چھو رہا ہو کہ دیگر شعرا کے وجود اور شاعری کو بلا جواز قرار دے۔جسے اپنی شاعری پر مان ہو کہ لاکھوں میں بکے گی وہ کسی دوسرے شاعر کی اس بات میں آ جائے کہ مے و جام کا سہارا لے کر بڑا شاعر بنا جا سکتا ہے۔اقبال ساجد خود کو عہدِ جدید کا نمائندہ کہنا اور کسی دوسرے شخص کو اپنے ہم پلہ نہ سمجھتا تھا ایسی شخصیت کسی مرعوبیت میں اس قدر بہک جائے کہ اپنی زندگی کی ناؤ ڈبو لے۔ان کی خود پسندی جہاں شعروں سے واضح ہے وہیں احمد ندیم قاسمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال ساجد جدید غزل گو کہلانے پر بضد رہتا تھا اور اپنے سے زیادہ عمر کے شعرا کی شاعری کو دورِ جدید کے تقاضوں کے حوالے سے غیر ضروری بلکہ بے معنی قرار دیتا تھا۔دوسری بات کی صحت پر بات ہو سکتی ہے مگر جہاں تک خود اپنے بارے میں اقبال ساجد کی ادعا کا تعلق ہے،وہ کم و بیش صداقت پر ہی مبنی تھا۔اس کی غزل کے موضوعات،اس کی منفرد لفظیات،اور اس کا خاص اپنا لہجہ اس کے ثبوت ہیں۔بے شک اس کے کلام میں جارحیت اور تلخی کے عناصر زیادہ ہیں مگر یہ عناصر غزل کے لیے ممنوع نہیں ہیں۔''(۶)

احمد ندیم قاسمی کی رائے کی روشنی میں بھی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال ساجد مرعوب ہونے والوں میں شامل نہیں لہٰذا اس کی کس خصلت کا الزام دوسروں پر دھرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔مزید یہ کہ عطاالحق قاسمی کی رائے جو ان کے کلیات میں شامل ہے بھی اسی طرح کی صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے:

> ''اقبال ساجد کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ اس نے تمام عمر شاعری کے علاوہ کچھ نہیں کیا حتیٰ کہ کبھی ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کی۔وہ اپنی شاعری میں جن خوب صورتی خیالوں میں مگن نظر آتا ہے۔ان کا پرتو کبھی اس کی شخصیت سے ظاہر نہیں ہوا۔چنانچہ مجھے آج سمجھ نہیں آ سکی کہ وہ اتنی اعلیٰ درجے کی شاعری کیسے کرتا تھا۔شاید اسی لیے اہلِ یونان شاعری کو دیوتاؤں کا انعام سمجھتے تھے۔''(۷)

اب یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ اقبال ساجد معاشرتی زندگی میں کچھ کامیاب نہ تھا بلکہ اس کی شاعری اور اس شاعری پر

خود ساختہ زعم نے اسے احساسِ برتری میں مبتلا کر دیا تھا اور عہد کی توقع سے کم پذیرائی نے اُسے ان راستوں پر گامزن کیا جو بعد ازاں اخلاقی ابتری اور پھر موت کا سبب بنی۔

اقبال ساجد کی شخصیت کا دوسرا پہلو شاعری فروخت کرنا تھا۔ ان کی شاعری عہدِ جدید کی شاعری تھی اور پھر شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کے حصول کے لیے اپنے اشعار کی فروخت ایسا المیہ ہے جس سے ان کی شخصیت مسخ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس عمل پر خود بھی نوحہ کناں ہیں اور اس کرب کی عکاسی اپنے ایک شعر میں کرتے ہیں:

یہ ترے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے(۸)

اسی طرح اپنی ایک اور غزل کے اشعار میں اسی کرب کو مختلف انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

کیا ملا اقبال ساجد جدتِ فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر ، دانتوں کا منجن بیچ کر
تو نے جو لکھا ہے اُس کو کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بُجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر
میرا پیراہن پہن کر ، لوگ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا ، اپنا نیا پن بیچ کر
عزتیں اُن کو ملیں ، جن کی کوئی عزت نہ تھی
ہم کہ رسوائی کا باعث ہو گئے ، فن بیچ کر(۹)

اقبال ساجد کا یہ رویہ اور اعلان ان کے کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی کرب ہے جو ان کا قاری اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ یہ ذہنی اذیت جو اپنی تخلیقات کو بیچ کر تخلیق کار محسوس کرتا ہے اس معاشرے اور ادبی دنیا کے منظر نامے پر ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ شعر خریدنے والوں کی پذیرائی نئی بات نہیں اور نہ ہی لفظوں کا بیوپار کرنے والے اس طرح کے جذبوں کا اظہار نہیں کرتے۔ اقبال ساجد کا یہ رویہ ان سے شاعری سے محبت کا مظہر ہے، ان کی شعر لاکھوں کے بدلے بک کر امیر ہونے کے خواب نے صورت بدلی تو امیر ہونے کے سہانے سپنے تو خیر مٹی میں مل گئے بس یہ اشعار اب چھوٹی موٹی ضرورتوں کو تسکین کے لیے ہی صرف ہوئے۔

اقبال ساجد نے بہادری سے اپنی اس مجبوری کا اظہار کر دیا اور ان کے مداحین نے اس رویے کو ہمدردی کی سطح پر لے

جاتے ہوئے، اسے نئی روش کی صورت پیش کیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ شاید یہ عمل دنیائے شعر وادب میں پہلی دفعہ منظرِ عام پر آیا ہو۔ حالانکہ ایسی باتیں ساغر صدیقی کے حوالے سے بھی مشہور ہوئیں۔ مظفر وارثی نے اپنی آپ بیتی ''گئے دنوں کا سراغ'' میں بھی اسی رویے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنی ذات اور شعری تجربے کی تحسین کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''عہدِ نوجوانی میں والد صاحب میری غزلوں کی اصلاح کے دوران حذف شدہ شعر، شاعری کے شوقین دوستوں میں بانٹ دیتے اور وہ یہی شعر سُنا کر مشاعرہ میں داد پاتے۔''(۱۰)

مظفر وارثی نے اپنے شعری سفر کی پختگی کا اظہار کرتے ہوئے، شاعری کے سفر کرنے اور شعرا کی پہچان بننے کے پس منظر میں کارفرما محرکات کو عطیہ کی صورت پیش کیا جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ تشاعر اقبال ساجد کے عہد سے پہلے بھی موجود تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مظفر وارثی کی خودستائی اپنی جگہ مگر ان کے والدِ گرامی شاعری کے کاروبار سے وابستہ تھے اور اس بات کا ثبوت وہ اشتہار ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''اوراق القوافی'' کے اندرونی صفحہ پر دیا (جہاں مطبع اور سنِ اشاعت درج ہوتا ہے) اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ہر قسم کے سہرے، قصیدے، غزلیں، رباعیات وغیرہ کہلانے کے لیے حسبِ ذیل پتے سے خط وکتابت کریں۔
> علامہ صوفی وارثی میرٹھی، رام گلی، لاہور۔''(۱۱)

اب ذرا ان ناموں پر بھی نظر ڈالیے جن کے حوالے سے اسی طرح کی خبریں مختلف ادوار میں گردش میں رہیں ان شعرا میں استاد شاعر نیاز کھتولوی، بیدل حیدری، ساغر صدیقی جیسے نام بھی شامل ہیں۔

اس ساری بحث کا مقصد اقبال ساجد جیسے غزل گو کی جدید شاعری پر ہمدردی کے وہ پردے چاک کرنا ہے جو اُن کے مدوحین نے ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے پیش کیے اور اس کوشش سے ان کی شاعری کے خصائص پسِ پشت چلے گئے۔ اقبال ساجد کی کہانی البتہ دیگر ناموں سے مختلف ہے۔ اس کی ضرورتیں اور شوق اُسے اس موڑ پر لے آئے کہ وہ روایتی بہانوں کے ساتھ بھیک مانگتا نظر آیا۔ کبھی اُسے مدہوش فٹ پاتھ پر دیکھا جاتا تو کبھی وہ اپنے بچوں اور گھر کی مجبوریوں کے نام پر ہاتھ پھیلاتے دیکھا جاتا۔ عین ممکن ہے کہ درج بالا آراء کی طرح کچھ لوگ اس کا الزام بھی دوسروں کے سر دھریں مگر حقیقت اس سے مختلف ہے، اُن کی شخصیت اخلاقی گراوٹ کی انتہا پر آ گئی تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہ خلافِ حقیقت خواب تھے جو انھوں نے اپنے فن سے منسوب کر رکھے تھے اور جس کا اظہار ان کے اہلِ خانہ نے کیا۔ بچپن سے معاشی حالات کی ابتری، ان کے ساتھ رہی، جغرافیائی تبدیلیاں اور بدلتے ہوئے زمانے نے بھی ان میں خاطر خواہ فرق نہ ڈالا اور یہ ابتری مزید سنگین ہوتی چلی گئی۔ بالآخر اقبال

ساجد زندگی کے میدان میں بری طرح ناکام رہا، اُسے پذیرائی تو ضرور ملی مگر ان کی توقعات کے مطابق نہیں۔ شراب اور دیگر نشہ آور اشیانے انھیں ایک ناکام شخص کی صورت دی۔ عزتِ نفس قربان کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرنے والا یہ منفرد شاعر بالآخر اسی حالت میں ۱۹ مئی ۱۹۸۸ء کو گھر کی دہلیز پر مردہ حالت میں پایا گیا۔ (۱۲)

اقبال ساجد نے غزل کو نئے آہنگ اور اسلوب سے روشناس کیا۔ غزل کے میدان میں یاس یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی بھی غزل کے میدان میں نئے اسلوب کے حوالے سے اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ اقبال ساجد کے ہاں غزل جیسی صنفِ سخن کو جس انداز میں برتا گیا شاید غزل کی طویل تاریخ کے تناظر میں ناقدین کے زود ہضم نہ تھا اسی لیے ان پر بہت کم لکھا گیا حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کے حق دار تھے۔ اُن کی غزل دبنگ انداز اور توانا آواز رکھتی ہے۔ ان کی پہچان غزل بھی اسی اسلوب اور انداز کی حامل ہے:

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں
لہو سے جو اٹھائی تھیں وہ بنیادیں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں(۱۳)

یہ غزل ان کی پہچان غزلوں میں سے ایک ہے، اپنے ارد گرد کے حالات کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ ایسا دیس جو خوابوں کی سرزمین تھی، حقیقت میں جائے اماں نہ بن پایا بلکہ ایک خوف اور دھڑ کا دلوں کو مسلسل لاحق ہے۔ عہد کی ستم ظریفی دیکھیے حقیقتِ حال کا یہ اظہار یہ سیاسی پنڈتوں کو بغاوت نظر آیا اور اس پر طرح طرح کے الزام بندھے مگر یہ فکر ایک شاعر کی نہیں بلکہ اس قوم کے ہر فرد کی تھی جو ہجرت کا سمندر عبور کر کے آسودگی کے لیے یہاں آیا تھا۔ شاعر نے جس انداز میں اس نظام پر طنز کی وہ اقبال ساجد کا ہی خاصا ہے، وہ اسی لب ولہجہ کو اپنی شاعری کا طرۂ امتیاز بتاتے ہیں اور یوں گویا ہوتے ہیں:

مہرے بھی غلط اُس کے ، وہ شاطر بھی غلط ہے
باطن ہی نہیں ، اُس کا تو ظاہر بھی غلط ہے
ترتیب کا قائل ہے نہ بکھراؤ کا قائل
اب اُس کے لیے رنگِ عناصر بھی غلط ہے
پھر کون کرے گا دہر میں منزل کا تعین
رستہ بھی نہیں ٹھیک ، مسافر بھی غلط ہے(۱۴)

ان اشعار میں لہجے کی کڑواہٹ کو کس روانی سے پیش کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے ان عوامل کو دیکھا، پرکھا، اپنے اندر اُتارا اور پھر شعر کی صورت دُنیا کو آئینہ دکھایا ہے۔اقبال ساجد کے پاس حالات کی سختی کے لیے لطیف پیرایہ موجود نہیں اور نہ ہی وہ اسے ان کے لیے مناسب سمجھتا ہے۔وہ اپنے طرزِ اظہار کو موضوع کی مناسبت سے برتنے کا فن جانتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی یہ دلیری عمومی رویوں کے برعکس پذیرائی حاصل نہیں کر پاتی۔اس دُھن میں شاعر دنیا کے ساتھ ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور یہی روش اس کی غزل کو جدت فراہم کرتی ہے۔وہ قحط الرجال کا المیہ سمجھتا ہے اور گویا ہوتا ہے:

سبھی کو شہر میں احساس ہے بے شکل ہونے کا
کئی برسوں سے قحطِ عکس ہے آئینہ خانے میں
پڑے ساجد نہ کیونکر کال اب ہر سُو ہرے پن کا
کہ بنجر لوگ پیدا ہو رہے ہیں اس زمانے میں (۱۵)

زمانے کا یہ رُوپ دیکھ کر شاعر کے پاس خوشی کے شادیانے نہیں وہ لوگوں کو ان کی اصل کی طرف لے جانا چاہتا ہے جہاں اپنی ذات کا ادراک ہو، اپنی شباہت کی پہچان ہو، اپنی شکل کے نقوش کی شناخت ہو، خلیفہ فی الارض کی معراج ہو مگر اس کی آنکھیں ایسے چہروں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔سچ بولنے کا یارا اور ہمت اُسے اس کی آزادانہ فکر نے عطا کی ہے۔وہ اس کے انجام سے واقف مگر بے خوف ہے:

کل کو جاری قتل کا فرمان بھی ہو جائے گا
دستخط تو ہو چکے اعلان بھی ہو جائے گا(۱٦)

اقبال ساجد کی غزل اس اسلوب سے مزین ہے۔درجنوں اشعار اسی مزاج اور لے سے رچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ممدوحین نے اس پر بڑا ظلم کیا اور اُسے مزاحمت کا حوالہ دے کر اُس کی غزل کے لطیف پہلوؤں سے صرفِ نظر کیا۔وہ فطرت سے پیار اور اس کا احساس کرنے والا شاعر ہے۔اس کی شاعری میں ثمر، شجر، پر، پرواز، پرندے اور خوشبو جیسی علامتیں اُس کے فطرت سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔اب یہ عقیدت تھی یا محدود زاویۂ نظر جس نے ان پہلوؤں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔اقبال ساجد کی غزلوں کے یہ اشعار فطرت سے اس کے لگاؤ کی عمدہ مثالیں ہیں:

میں ہوں خوش بخت سبھی رنگ ملے ہیں مجھ کو
تتلیوں نے مجھے تصویر بنا کر دی ہے(۱۷)

اقبال ساجد کی غزل میں لطیف جذبوں کی عکاسی کی ہی خوب ہے۔وہ شعری علامتوں کی کائنات رکھتا ہے۔تتلی کا تصویر

بنا کر دینا، کیا خوب اظہار ہے۔اس کے پاس کی رنگینیاں فطرت کی رنگینیوں کا مظہر ہیں۔وہ اپنے آپ کو اس حوالے سے خوش بخت کہتا ہے کہ ایک ہی طرزِ حیات اس کا کل اثاثہ نہیں:

کھول یوں مٹھی کہ اِک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک ، لمحہ کوئی او جھل نہ ہو(۱۸)

مٹھی میں جگنو، روشنی پر دسترس کی علامت کے طور پر اقبال ساجد کا ایسا موضوع ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ جگنو اور زندگی کے لمحات کا تلازمہ بھی غزل کی ملائمت کو بڑھاتا ہے۔ فطرت سے ایسی علامتیں اور استعارے مستعار لے کر اُسے شعر کے پیر ہن میں دیدہ زیب بنانے کا فن اسے خوب آتا ہے:

دوستو! بینائی بخشے گی تمھیں ان کی اڑان
پنچھیوں کو چھوڑ دو بے بال و پر کرتے ہو کیوں؟(۱۹)

اقبال ساجد فطرت سے پیار کرتا ہے۔ وہ پرندوں کی پرواز اور اُڑان کا شیدائی ہے۔ اسے بے بال و پر پرندے اور قفس کے رحم و کرم پر اُڑانیں اچھی لگتیں۔ وہ اپنے ہم جنسوں سے استفسار کرتا ہے کہ اپنی آنکھوں کو بے جان کرنے پر کیوں تُلے ہو۔ پرندوں کی پرواز سے آنکھوں کی بینائی کو تراوت بخشو:

سینچوں گا صحنِ باغ میں شبنم رتوں کے ساتھ
سوکھے ہوئے گلوں میں عرق چھوڑ جاؤں گا(۲۰)

اقبال ساجد اپنی زندگی کی تلخیوں کو نظر انداز کر کے زمانے کی از سرِ نو تعمیر کا جذبہ رکھتا ہے۔ اُسے اپنی زندگی کے مصارف کا ادراک ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس حیاتِ فانی کے فنا کے لمحے سے پہلے اسے فطرت سے نبھا کر کے بقا کیسے بنانا ہے، وہ خوب جانتا ہے۔ گلاب، پھول اور باغ کو رعنائی بخشنے کا فن حیاتِ دوام کا وہ گُر ہے جس سے اشرف المخلوقات بے گانہ ہو چکا۔ اس کے دل میں چھپی ہوئی خواہش انگڑائی لیتی ہے اور کائنات کی بقا کا راز بناتی ہے تو شعر خوب صورت اظہار بن جاتا ہے:

بہت ہی پیار ہے اُس سے مجھے خداوندا
کہیں وہ پھول سا چہرہ نہ سنگ ہو جائے
ہوا کے رُخ پر اڑائی اُمید یوں ساجد
کہ سرخرو کسی صورت پتنگ ہو جائے(۲۱)

شاعر کی حِسیات لطیف جذبوں کی ترجمان ہے۔ وہ پھول چہرے کی تازگی کے دوام کی دُعا کرتا ہے اور اسی میں زندگی کی

نوید پاتا ہے۔ اُسے پتنگ کی اڑان سے دل چسپی ہے۔ اُسے امید اور ہوا کے دوش کا ادراک ہے۔ فطرت کے ان رنگوں سے پیار اور ان سے معانی تراشنے کا فن کارانہ اظہار اُس کی شاعری میں تنوع کے رنگ بھر تا چلا جاتا ہے:

مرجھائے کوئی پھول ، نہ ویراں ہو کوئی شاخ
گلزارِ صداقت سے پرندوں کی چہک آئے(۲۲)

فطرت سے پیار اور لگن کی یہ صورت دُعا بن کر اُس کے لبوں پر آتی ہے تو وہ کائنات کو ہنستا باغ دیکھتا ہے۔ اُسے یہ احساس بھی ہے کہ مکر و فریب کے جھکڑ سے یہ خوب صورت آشیانہ، ویرانوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ سچ کے آنگن میں پھول کھلتے اور پھولوں پر دوام کی خواہش اور تمنا لیے ہوئے ہے۔

اقبال ساجد کی غزلوں میں فطرت سے عقیدت و اُلفت رنگا رنگی کی کیفیت سے آشکار ہے وہ حساس دل کا مالک ہے۔ تمنائیں، خواہشیں انفرادی سطح سے نکل کر اجتماعی بن کر جاگزیں ہوتی ہیں تو وہ حرفِ دعا بلند کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی رشتوں کی بازگشت بھی خوب ہے۔ وہ ان رشتوں سے جڑی مقدس کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے پاس ماتا کے جذبے کی بھرپور عکاسی ہے۔ وہ ماں جیسے انمول رشتے کو محض محبت کے روپ میں نہیں دیکھتا بلکہ اِسے ایک طاقت اور ہمت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

جب ماں کی دُعا ساتھ ہے ، سانپوں کے نگر میں
ساجد میں حواس اپنے کبھی گُم نہیں کرتا(۲۳)

اور پھر اسی ہمت اور طاقت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ ، مری ماں کی دُعا نے رکھا(۲۴)

اسی ماتا کے جذبے کو علامت بنا کر وہ خواہش اور دل میں ماں بیٹے کا رشتہ دکھاتا ہے تو قاری ایک لمحے کے لیے ماں کے دل میں پیدا ہوتے اولاد کے لیے اوہام اور وسوسے محسوس کرتا ہے۔ یہ نیا پن کسے میسر آئے کہ علامتوں کا استعمال انسانی حِسیات کو جاودانی بخشے:

حسرتِ معصوم سے یہ مادرِ دل نے کہا
گھر سے باہر مت نکلنا تیز آندھی ہے بہت(۲۵)

اسی طرح آنگن میں کھیلتے بچوں کی مسکراہٹ کے معانی اُسے خوب آتے ہیں۔ وہ سفر کی تھکان پر ایک معصوم مسکراہٹ

کو فوقیت دیتا ہے۔ یہ ایسی ازلی سچائی ہے کہ انسانی رشتوں کے تقدس سے باوضو ہو کر انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کیفیت کا اظہار یوں کرتا ہے:

سفر سے لوٹ کے رکھا تھا گھر میں پہلا قدم
ہنسے جو پھول سے بچے تھکان بھول گئے(۲۶)

اقبال ساجد کی غزل میں فلسفہ بھی مضمر ہے مگر یہ فلسفہ کسی ادق زاویے کا متلاشی نہیں بلکہ اسلوب کی روانی اور سادگی کے ساتھ اپنی پوری آب و تاب دکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک زمین و آسمان کا تعلق اٹوٹ ہے۔ خوشی، امید، مایوسی کے معانی الگ ہیں۔ کائنات کی ازلی سچائیاں متنوع روپ دھار کر نمودار ہوتی ہیں۔ ان کی غزلیں ایسے موضوعات سے بوجھل نہیں ہوتیں بلکہ اپنی دل کشی میں اضافہ کرتی دکھائی دیتی ہیں:

یہ خود بھی آسمان کی وسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو چھت پر پڑا ہوا
مارا کسی نے سنگ تو ٹھوکر لگی مجھے
دیکھا تو آسماں تھا زمیں پر پڑا ہوا(۲۷)

یا پھر:

رہ گئی تھی لعل بننے میں کمی اِک آنچ کی
آنکھ سے گر کر لہو کی بوند پانی ہو گئی(۲۸)

خواہش اور اُمید کے درمیان رشتہ پیدا کرتے ہوئے اس اٹوٹ تعلق کے فلسفے کو مقامی رنگ دے کر نکھارتے ہوئے اقبال ساجد منفرد شاعر نظر آتا ہے:

خواہش و اُمید کی چلنے لگی آندھی بہت
تنگ روزانہ مجھے کرتی ہیں یہ ماں دھی بہت(۲۹)

اقبال ساجد کی شاعری زندگی کے سارے رنگ سموئے ہوئے ہے۔ احمد ندیم قاسمی جیسا شاعر اس کی خود پسندی کے دعوے کو بجا کہتا ہے۔ جدت کا علمبردار شاعر ایک للکار رکھتا ہے۔ وہ نقشِ کہن مٹانے کا قائل ہے تو ساتھ ہی ساتھ بغض ، حسد، عناد کے معانی بھی جانتا ہے۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ مات کھائے چہرے اندر ہی اندر ایسی کیفیات کو جگہ دیتے اور پھر تلخ لہجوں اور کھردرے لفظوں میں گویا ہوتے ہیں۔ اس کی یہ للکار محض دعویٰ نہیں بلکہ ایک ایسا چیلنج ہے جس کے لیے وہ دعوت دیتا

ہے مگر سامنے آکر مقابلہ کرنے کی ہمت کسی میں نہیں:

نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں
فراق و فیض و ندیم و فراز کچھ بھی نہیں
پُرانے زمانے کے بوسیدہ اشتہاروں کا
فصیلِ ملک سخن پر جواز کچھ بھی نہیں
ہے نسلِ نو سے خدا واسطے کا بیر انہیں
وگرنہ بغض و حسد کا جواز کچھ بھی نہیں
مشینی دور میں کیا قصہٗ لب و رخسار
حکایتِ شبِ زلف دراز کچھ بھی نہیں(۳۰)

اقبال ساجد کی اس غزل کا چرچا ہوا، اس طرح کی للکار شعر و سخن میں پہلے کبھی دیکھی سُنی ہو گی۔ اسے جدت پسندی کہیے یا پھر شعری رجحانات پر طنز، شاعر اپنے شعری نظریے سے محبت کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہاں شاعروں سے زیادہ ان شعری زاویوں کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے جن سے حقیقت سے آنکھ چُرانے کی روش پنپتی ہے۔ وہ اس طرح کی للکار کو مقابل کھڑے شخص کے لیے عمومی رنگ میں پیش کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

مزا مل جائے گا تجھ کو بھی سنگِ راہ بننے کا
ترے جیسے تو مرے پاؤں کی ٹھوکر میں رہتے ہیں(۳۱)

اس کی یہ للکار صرف شعر و سخن کے میدان تک محدود نہیں بلکہ وہ اسے ارد گرد کے سیاسی منظر نامہ پر طنز کی صورت بھی پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں:

دل کی ساری سرخپوشی ہے ، پسِ دیوارِ یار
اس لیے بے چین ہے یہ سرحدی گاندھی بہت(۳۲)

اقبال ساجد کی غزل عہدِ جدید کی غزل ہے۔ اس کا اسلوب متنوع کیفیات رکھتا ہے۔ اس کی شاعری امید، خواہش، حالات کی عکاسی، نئے موضوعات کی تلاش، فکر و فلسفہ، کائنات کا حُسن، دُعائیہ اشعار، لطیف جذبے، کٹھن منازل، سب کا ادراک رکھتی اور قاری کو اس سے آگہی فراہم کرتی ہے۔ وہ لگی بندھی ردیفوں کا محتاج نہیں، موضوعات سے مناسب ردائف سے ان کے اشعار کا حُسن مزید بڑھ جاتا ہے۔ وہ انسان سے محبت کرتا ہے، انسانی قدروں کی پامالی اُسے راس

نہیں،انسانی جذبوں کی تجارت منہ کھولے کھڑی ہے تو وہ اِسے مصلحتِ وقت سمجھ کر گلے نہیں لگاتا،وہ عہدِ موجود کے اُصولوں کو تسلیم نہیں کرتا،اُسے دربارِ شاہ میں رکوع و سجود کے معنی پتہ ہیں مگر یہ روش قبول نہیں،اُسے پرندوں کی پرواز بھلی لگتی ہے، ثمر بار اشجار سے محبت ہے،وہ جگنوؤں، تتلیوں کی بات کرتا ہے،اُسے درختوں پر بنے دلوں کی اہمیت کا پتہ ہے،وہ چاہتا ہے کہ محبتوں کی نشانیاں قائم دائم رہیں:

کاٹو اِسے اجاڑ سمجھ کر نہ دوستو
اس پیڑ کے تنے پہ ہیں دو دل بنے ہوئے(۳۳)

ایسے لطیف جذبوں کے شاعر کو محض مزاحمت کے پیمانے پر پرکھنا سراسر ناانصافی ہے،وہ زندگی کی حقیقتوں کا پارکھ ہے۔ تلخی کو تلخ لہجے اور آسودگی کو آسودگی کہنا جانتا ہے،اُسے امید،خوشی،چاہت،مامتا کے معانی ازبر ہیں،وہ سایہ،دھوپ،زہر، سانپ،خواب،اچھائی،برائی کے پیمانوں کی تمام تر کیفیات اپنے اندر سموئے ہوئے دنیائے شعر کو ایسی قوسِ قزح فراہم کرتا ہے جس میں زندگی کے سارے رنگ شامل ہیں۔

بلاشبہ ایک ناکام فرد،ایک کامیاب شاعر ہے۔اُس کی شاعری ہی اُس کی خوبی ہے لہٰذا شخصی پیمانوں سے ہمدردی سمیٹنے کا عمل اس شعری اُفق کو ماند کرتا ہے۔اقبال ساجد کی شاعری دورِ جدید کی نمائندہ ہے۔

حوالہ جات

۱. جواز جعفری:"اقبال ساجد:شخصیت و فن (پاکستانی ادب کے معمار)"،اکادمی بازیافت،اسلام آباد،۲۰۱۰ء،ص ۱۲
۲. ایضاً،ص ۱۵
۳. غلام محمد قاصر:"کلیاتِ قاصر"،رنگِ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۹ء،ص ۳۱۱
۴. جواز جعفری،ڈاکٹر:"کلیاتِ اقبال ساجد"،جنگ پبلشرز،لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۳۱
۵. ایضاً،ص ۳۱
۶. احمد ندیم قاسمی:"فلیپ:کلیاتِ اقبال ساجد"
۷. عطاالحق قاسمی:"فلیپ،مشمولہ:کلیاتِ اقبال ساجد"
۸. اقبال ساجد:"کلیاتِ اقبال ساجد"،ص ۲۲۲
۹. ایضاً،ص ۳۰۴

۱۰. مظفر وارثی: "گئے دنوں کا سُراغ"، خزینۂ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ٦٧
۱۱. صوفی وارثی میرٹھی، علامہ: "اوراق القوافی"، وارثی کتب خانہ، لاہور، س ن
۱۲. جواز جعفری، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال ساجد"، ص ۳۴
۱۳. ایضاً، ص ۲۲٦
۱۴. ایضاً، ص ۲۲۹۔۲۳۰
۱۵. ایضاً، ص ۲۳۳۔۲۳۴
۱٦. ایضاً، ص ۲۳۵
۱۷. ایضاً، ص ۱٦۷
۱۸. ایضاً، ص ۱۵۹
۱۹. ایضاً، ص ۱۴۸
۲۰. ایضاً، ص ۱۳۸
۲۱. ایضاً، ص ۱۷۲
۲۲. ایضاً، ص ۲٦۳
۲۳. ایضاً، ص ۱۰۰
۲۴. ایضاً، ص ٦۷
۲۵. ایضاً، ص ۱۴۴
۲٦. ایضاً، ص ۲۸۰
۲۷. ایضاً، ص ۲۰٦
۲۸. ایضاً، ص ۱۸۸
۲۹. ایضاً، ص ۱۴۳
۳۰. ایضاً، ص ۲۲۷۔۲۲۸
۳۱. ایضاً، ص ۲۲٦
۳۲. ایضاً، ص ۱۴۴
۳۳. ایضاً، ص ۲۰۰